

بیگم انیس قدوائی



بیگم انیس قدوائی کی پیدائش تقریباً 1905ء میں بارہ بنکی (پونہ پی) کے مشہور قدوائی خاندان میں ہوئی۔ قدوائی خاندان کا موروثی تعلق قاضی قدوۃ الدین سے تھا جو مکہ سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ انیس قدوائی کے والد دلائی علی بارہ بنکی شہر کے مشہور وکیل تھے۔ اس تعلیم یافتہ ماحول میں بھی لڑکیوں کے پرہیز کا سخت اہتمام کیا جاتا تھا اور گھریلو تعلیم و ابتدائی دینیات سے آگے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا لڑکیوں کے لیے معیوب سمجھا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انیس قدوائی نے پردے میں ہی صرف گھریلو تعلیم یعنی مریدہ ہی کتابیں، دینیات اور اردو فارسی تک تعلیم حاصل کر سکیں۔ انیس قدوائی کی شادی مشہور کانگریس رہنما اور وزیر رفیع احمد قدوائی کے چھوٹے بھائی شفیع احمد قدوائی سے ہوئی۔ انیس قدوائی کی ایک صاحبزادی کوثر قدوائی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ رفیع احمد قدوائی کے خاندان میں شادی ہونے کی وجہ سے بیگم انیس قدوائی کے لیے مزید تعلیم کے دروازے کھل گئے۔ وہ اب سیاست میں بھی حصہ لینے لگیں اور اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی۔ اردو ادب سے فطری دلچسپی تھی اس لیے مضامین بھی لکھنے لگیں۔ گاندھی جی کی ایماء پر بیگم انیس قدوائی دہلی چلی گئیں اور ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لینے لگیں۔ کانگریس میں شامل ہو کر مجاہد آزادی کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ 16 جولائی 1982 کو بیگم انیس قدوائی کا انتقال ہو گیا۔

سیاست کی مصروفیات کے باوجود بیگم انیس قدوائی اردو ادب کی خدمت سے غافل نہیں ہوئیں اور قلمی جہاد کے ذریعہ آزادی کے خونچکاں واقعات قلم بند کئے جو آزادی کی چھاؤں میں کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپ گئے۔ یہ کتاب انیس قدوائی کی ایک تاریخی تصنیف ہے۔ جس کا بنیادی موضوع 1947ء کا خوفناک فرقہ وارانہ فساد ہے۔ ان کی دوسری کتاب 'اب جن کے دیکھنے کو.....' خاکوں کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب 'نظرے خوش گزرے' ہے جو طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کی آخری اور چوتھی کتاب 'غبار کارواں' ہے جو ان کی نامکمل خودنوشت سوانح ہے۔

قدوائی خاندان

شفیع احمد قدوائی رفیع صاحب سے دو سال چھوٹے اور مجھ سے تقریباً نو دس سال بڑے تھے۔ شکل و صورت میں بھی بڑے بھائی سے کافی مختلف تھے اور طبعاً بھی ذرا جھیکھے مزاج کے تھے۔ رفیع بھائی جتنے گول منہول تھے، یہ اتنے ہی دبے چنگے اور لانبے۔ آخر عمر میں جسم بھاری پڑ گیا تھا۔ بہت ہی مختلط طبیعت کے انسان تھے۔ زمانہ طالب علمی میں رفیع بھائی کی حد سے بڑھتی ہوئی فضول خرچیوں اور فیاضیوں پر معترض بھی ہوتے تھے اور جب ان کی جیب خالی دیکھتے تو یہ بھی برداشت نہ ہوتا کہ ان کا ہاتھ پیسے کی کمی کی وجہ سے رک رہے۔ اس لیے اپنی پس انداز کی ہوئی رقم جو جیب خرچ سے بچ جاتی بھائی کو پیش کر دیتے تھے۔

1920 میں انہوں نے بی اے کرنے کے بعد خاندانی حالات سے مجبور ہو کر آگے پڑھنے کا خیال چھوڑ کر ملازمت کی خواہش کی اور ابا جان (امتیاز علی) کی کوشش سے ڈپٹی کلکٹری میں نامزد ہوئے۔ مگر انگریز کمشنر سے ملاقات کے وقت وہ آداب و مراسم جوان دنوں حکام کے لیے رائج تھے، بجا نہ لاسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمشنر نے ناخوش ہو کر ان کا نام خارج کر دیا اور ان کے والد سے شکایت کی۔ 1919ء میں جب رولٹ ایکٹ کے سلسلے میں ہنگامہ شروع ہوا اور کانگریس نے نیا موڑ لیا تو رفیع بھائی نے اپنے گاؤں اور ضلع میں کانگریس کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ کچھ یہ خبریں بھی کمشنر تک پہنچیں۔ ابا جان اس ناکامیابی سے بہت متاثر ہوئے مگر یہ دونوں بھائی خوش تھے کہ چلو جان چھوٹی۔

مگر حالات کا تقاضا تھا کہ ذریعہ آمدنی کچھ ہو۔ اس بیچ میں مجھ سے شادی بھی ہو گئی۔ آخر کار اسسٹنٹ کو آپریٹو رجسٹرار کی پوسٹ مل گئی اور تقریباً ایک سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ 1921 میں تحریک عدم تعاون (نان کو آپریشن) میں ملازمت سے استعفا دے کر شامل ہو گئے۔

ان کے والد (ابا جان) اپنے لائق ترین بیٹوں کی اس نالائقی پر تلملا اٹھے، لیکن وہ ایسے سخت گیر باپ تو نہ تھے کہ نوجوانوں کو اپنی مرضی اور اشاروں پر چلانا ضروری سمجھتے ہوں البتہ اپنی تکلیف خاندانی صورت حال، زمین

داری کی انتہا حالت سب کا تذکرہ کر کے انہیں روکنے کی کوشش ضرور کی۔ خود انہیں بیٹوں کی ان حرکتوں کی وجہ سے اپنی تحصیلداری بھی خطرے میں نظر آئی مگر جوان بیٹوں کو جبراً اپنی رائے ماننے پر مجبور نہیں کیا نہ انہیں گھر سے نکل جانے کو کہا۔ میں 1920 میں اپنی عمر اس قابل نہ ہونے کے باوجود کانگریس کی ممبر بن چکی تھی اور 1921 میں زمانہ کانگریس کمیٹیاں قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی بلکہ اس سلسلہ میں مسولی میں ایک بڑا جلسہ بھی کر ڈالا تھا۔ شفیع صاحب ملازمت چھوڑ کر آئے تو دل خوش ہو گیا اب وہ بھی باقاعدہ ممبر تھے اور دسمبر 1921 میں سٹیہ گزہ تحریک میں حصہ لیتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔

دیہات سے سٹیہ گزہ جتنے آتے تھے، ضلع کے صدر مقام بارہ بنکی میں گرفتاری کے لیے اپنے کو پیش کر دیتے تھے اس سے پہلے علی گڑھ سے بار بار آکر رفیع صاحب نے دیہات کا پیدل، تیل گاڑی اور یکہ پر مسلسل سفر کر کے یہ سب گاؤں آگنا کر دیئے تھے۔ ضلع کے ساتھی ست پریمی جی وغیرہ ان کی آمد اور مشوروں کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب میرے خاندان کے تقریباً دس بارہ افراد بیک وقت گرفتار ہو گئے۔ گرفتار ہونے والوں میں میرے دورشتہ کے چچا ارشد علی اور نسیم احمد کے علاوہ خالو جان نواب علی وکیل وراثت علی قدوائی کے والد ریاست علی، جو اپنے بزرگ رشتہ کے باوجود رفیع بھائی کے گہرے دوست بھی تھے۔ میرے ماموں جان، ایک رشتہ کے بھائی، غرض نو جوانوں کی اس گرفتاری کے بعد اب گھر میں صرف بڑھے دادا (ابا جان کے چچا) باقی تھے۔ ابا جان اپنی ملازمت پر شاید بجنور میں تھے۔ ظاہر ہے یہ خبر سن کر انہیں بہت شاک پہنچا۔ ان بچاروں کو یہ پتہ بھی نہ تھا کہ گاؤں اور ضلع کے تمام نو جوان ایک دم سرکار برطانیہ کے باغی بن جائیں گے۔ اتفاق دیکھیے، اسی دن یا دوسرے دن میں ایک بچی کی ماں بن گئی۔ میری اس نازک حالت کی وجہ سے شفیع صاحب پریشان تھے۔ لیکن ملازمت چھوڑنے پر انہوں نے کچھ رقم اس موقع کے لیے مخصوص کر کے رکھوا دی تھی اس لیے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ یہ لڑکی مجھ سے صرف سولہ سال چھوٹی تھی۔ آزادی کی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی، اس لیے میں نے اس کا نام آزادی رکھا۔

لیکن میری ماں کو یہ بھونڈا سا نام پسند نہ آیا اور انہوں نے اس کا حقیقہ رفیعہ سلطان پر کروایا پڑھنے والوں کو تعجب ہوگا، اگر میں یہ بتاؤں کہ اس سے ایک سال پہلے پندرہ سال کی عمر میں بھی ایک کمزور منحنی بچے نے مجھ سے جنم

لیا تھا۔ جو صرف چند دن دنیا کی ہوا کھا کر رخصت ہو گیا۔ اس کے مرنے پر میں بغیر کچھ سنے رو رہی تھی اور میری ماں مجھے تسکین دلا سادے رہی تھیں ایک لیڈی ڈاکٹر جسے شفیع صاحب نے لکھنؤ سے بھجوایا تھا، ایسے وقت پہنچی جب میں پرانی دانی کی تختہ مشق بن چکی تھی۔ ظاہر ہے اس کے بعد میری والدہ مجھے علاج کے لیے لکھنؤ لے گئیں اور ایک ماہ بعد جب صحت یاب ہوئی تو پھر بالائے غم ہائے دگر میں گرفتار ہو گئی۔ یہ سب میری افتاد طبیعت کے خلاف تھا۔ پہلے بچے کے لیے اس وقت نہ جانے کیوں آنسو نکلتے ہی چلے آ رہے تھے۔ لیکن چند دن بعد اپنے دوستوں سے خوشی کا اظہار کرتی تھی کہ اچھا ہوا واپس چلا گیا بیکار مجھے ستاتا۔

مگر شفیع صاحب جوان تھے ان کے جذبات مجھ سے بالکل جدا ہوتے تھے۔ میری سیاسی دلچسپیاں خاندان والوں کی نظر میں معیوب تھیں۔ لیکن شفیع صاحب ہمیشہ خوش ہوتے تھے جب دہشتی کپڑے جلا دینے کو کانگریس کا حکم ہوا تو میں نے آگ کے شعلوں میں شادی کا جوڑا بھی ڈال دیا، رفیع بھائی نے کہا۔ 'شفیع کے کپڑے بھی لاؤ، اتفاق سے ان کا بھی شادی ہی کا ایک جوڑا تھا۔ اس وقت میری ماں رودیں، ان کی نظر میں یہ بڑی منحوس بات تھی۔ اس وقت تک جیل سے متعلق بزرگوں کا نظریہ چوروں، ڈاکوؤں والی جیل کا تھا، اس لیے بڑا رونا دھونا گھروں میں ہوا، سوا میرے گھر کے۔

لفظ و معنی

احتیاط برتنا	-	مختاط
دل کھول کر خرچ کرنا	-	نیاضی
اعتراف کرنے والا	-	مقرض
جمع کرنا	-	پس انداز کرنا
مقرر ہونا	-	نامزد ہونا
دوستانہ تعلقات	-	مراسم
رواج پا جانا	-	راج ہونا
بہت زیادہ غصہ ہونا	-	تللانا
سخت مزاج ہونا	-	سخت گیر ہونا
زمین داری	-	تحصیل داری
زبردستی	-	جبرا

منحی - نانا قد، دہلا پتلا، مکرور
معیوب - جس کو لوگ عیب سمجھتے ہوں

آپ نے پڑھا
□ جنگ آزادی کے دوران قدوائی خاندان کے لوگوں کی سرگرمیوں کا مختصر سا حال آپ نے گذشتہ صفحات میں پڑھا
بیگم انیس قدوائی کی خودنوشت کا ایک حصہ ہے۔ اس میں خاص طور پر رفیع احمد قدوائی کا حال بیان ہوا ہے جو ایک
اہم مجاہد آزادی تھے۔

- آپ بتائیے
1. بیگم انیس قدوائی کا یہ مضمون کس صنف سے متعلق ہے؟
 2. مضمون 'قدوائی خاندان' کے تخلیق کار کون ہیں؟
 3. بیگم انیس قدوائی کی پہلی کتاب کب شائع ہوئی؟
 4. بیگم انیس قدوائی کا انتقال کب ہوا؟

- مختصر گفتگو
1. انیس قدوائی کی تعلیم سے متعلق مختصر جواب دیجیے۔
 2. بیگم انیس قدوائی کی تصنیفات کے بارے میں لکھیے۔
 3. خودنوشت کی تعریف کرتے ہوئے بتائیے کہ اس کا تعلق کس صنف ادب سے ہے؟

- تفصیلی گفتگو
1. بیگم انیس قدوائی کے حالات زندگی کے بارے میں بیان کیجیے۔
 2. تحریک آزادی پر روشنی ڈالے۔
 3. قدوائی خاندان کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیجیے۔

- آئیے، کچھ کریں
1. بیگم انیس قدوائی کی سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں اپنے استاد سے معلومات حاصل کیجیے۔
 2. تحریک آزادی میں قدوائی خاندان کی خدمات کے موضوع پر ایک مذاکرہ کیجیے۔

عصمت چغتائی

اردو کی خواتین نثر نگاروں میں عصمت چغتائی کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے متعدد افسانے اور ناول لکھے ہیں۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے جس نے ادب اور زندگی کے براہ راست رابطے پر زور دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ادب خارجی حالات کی پیداوار ہوتا ہے۔ ادب ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا صرف ترجمان نہیں ہوتا بلکہ ہمارے مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔



عصمت چغتائی نے بڑی جرأت اور بے باکی کے ساتھ معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔ ان میں جنسی نفسیات ایک ایسا موضوع ہے جس پر قلم اٹھاتے ہوئے بہت سے فنکار خود جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں مگر عصمت چغتائی نے اس موضوع کو بڑے معروضی انداز میں پیش کیا ہے اور کہیں بھی خود جذباتیت کی شکار نہیں ہوئی ہیں۔ عصمت نے معاشرے میں عہدے، منصب، دولت و ثروت اور خاندانی وجاہت کے بہانے عیش پرستی کرنے اور کمزور طبقے کا استحصال کرنے والے افراد کے پول کھول دیے ہیں۔ افسانوں کی طرح ان کی خودنوشت میں بھی بے باکی، بے خوفی، جرأت اور انفرادیت موجود ہے۔

عصمت 1910 میں بڑایوں میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام میرزا قسیم بیگ چغتائی تھا۔ والدہ کا نام نصرت خانم تھا۔ عصمت کے سات افسانوی مجموعوں کے علاوہ کئی ناول شائع ہو چکے ہیں۔ چھوٹی موٹی، بدن کی خوشبو، لحاف، ضدی، ٹیڑھی لکیر، سوداگی اور ایک قطرہ خون، ان کی مشہور تخلیقات ہیں۔ ان کا انتقال 1991 میں ہوا۔

میرا ادنیٰ سفر

دو ہیال والوں کا خیال تھا کہ میں پورم پورا اپنی نہیال والوں پر گئی ہوں۔ گلوڑے شیخ پتلی دال کھانے والے، مگر نہیال والوں کو یقین تھا کہ میں سو فیصدی دو ہیال والوں پر پڑی ہوں۔ وہی اپنی پھوپھی جیسا تہا اور گز بھر کی زبان۔ چنگیز خاں کی اولاد سے اور کیا امید کی جاسکتی ہے۔

لیکن اگر کوئی اماں سے پوچھتا کہ بیٹی کو کیا ہو گیا تو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔ 'نہ دو ہیال کا قصور نہ نہیال کا، یہ سب نصیب کا پھیر ہے۔'

ایسی صورت میں کس کا نام لے دوں۔ وہ بیچ جس سے میری ہستی وجود میں آئی قطعی میٹر ہا میٹر ہا نہ تھا۔ ضرور پالنے پونے میں کہیں بھول چوک ہوگی۔

مگر مجھے بذات خود اس ماحول سے کوئی شکایت نہیں، جہاں میری تراش خراش ہوئی۔ کچر پکڑ بچوں کے جم غفیر میں ایک پایادہ سپاہی کی طرح تربیت پائی۔ نہ لاڈ ہوئے نہ نخرے، نہ کبھی تعویذ گنڈے بندھے نہ نظر اتاری گئی۔ نہ خود کو کبھی کسی کی زندگی کا اہم حصہ محسوس کیا۔

بہنیں چونکہ بڑی نکل گئیں اس لیے بھائیوں کی صف میں جگہ ملی۔ کھیل کود کا زمانہ انہیں کے ساتھ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور ہاکی کھیل کر گزرا۔ پڑھائی بھی ان کے ساتھ ہی ہوئی۔ سچ پوچھیے تو اصل مجرم میرے بھائی ہی تھے۔ جن کی صحبت نے مجھے آزاد خیالی سے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ شرم و حیا جو عام طور پر درمیانہ طبقہ کی لڑکیوں میں لازمی صفت سمجھی جاتی ہے، پنپ نہ سکی۔ چھوٹی سی عمر سے دوپٹہ اوڑھنا، جھک کر سلام کرنا، شادی بیاہ کے ذکر پر شرمانے کی عادت بھائیوں نے چھیڑ چھاڑ کر پڑنے ہی نہ دی۔ سوائے عظیم بھائی کے سب ہی گھر میں چاق و چوبند تھے۔ کنبہ کا کنبہ حد درجہ بانڈاق اور باتونی، آپس میں چونچیں چلتیں، نئے نئے جملے تراشے جاتے، ایک دوسرے کی دھجیاں اڑائی جاتیں، بچے بچے کی زبان پر سان رکھ جاتی۔

اباپشن لے کر آگرہ کے موروثی گھر میں رہنے لگے۔ کھلی ہوا میں اڑنے کے بعد ایک دم سے نہایت بوسیدہ

ماحول کی گھٹن سے واسطہ پڑا۔ کہاں فٹ بال اور گلی ڈنڈا اور کہاں آگرہ محلہ پنپہ شاہی کی بوسیدہ گھیاں اور ان گھٹی ہوئی گلیوں میں پلنے والی جھکی جھکی نیم بدقوق لڑکیاں جو اپنے دل کی دھڑکن سے سہم جاتیں۔ میری ان لڑکیوں سے بالکل نہ بنی اور ان بڑھیوں سے بھی ٹھن گئی جو مجھے چھبوں پر قلاتنجیں بھرتا دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتیں۔

’نوج بوا، ٹچھو کی لونڈیا ہے کہ موا بجا رتوبہ توبہ۔‘

اور میری اماں جان نصرت خانم جنھیں لوگ پیار سے ٹچھو کہتے تھے۔ شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتیں۔ اور آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔ عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔ مری پٹی مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت، دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔ مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتی تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔ اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنادے کہ میں بھی چھت پر پتنگ اڑانے پر نہ پڑوں۔ گلیوں میں کبڑی کھیل سکوں اور آزادی سے بندروں کے پیچھے بھاگتی پھروں مگر آگرہ میں گندی گلیاں ہی نہ تھیں ان گلیوں میں سارے دور اور قریب کے رشتہ دار بھی رہتے تھے جن سے اماں لرزا کرتیں۔ جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے اپنے کنبہ میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑ گئیں۔

مگر مجھے آگرہ کی ان شرمیلی دہلی دہائی لڑکیوں سے مجبوراً بہنا پنا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ ہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ ہیں۔ چھپ کر وہ گل کھلائے جاتے ہیں کہ الہی توبہ۔ بڑھیوں کو چٹلیوں میں الو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پیٹگیں بڑھتی ہیں۔ مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہت آئی۔

آگرہ کی مکروہ فضا سے جلد ہی پیچھا چھوٹ گیا اور ہم لوگ علی گڑھ منتقل ہو گئے۔ اماں کو سبھی خاندان والوں سے وحشت ہوتی تھی۔ علی گڑھ کی کھلی ہوا میں پھر ہماری پرانی زندگی لوٹ آئی..... وہی پھوس کے بنگلے ڈگی کا کنارہ اور ہرے بھرے کھیت اور ان کھیتوں میں گلڑیاں، کھیرے چرانا، پیڑوں پر چڑھنا اور پھر مجھے اپنے لڑکی ہونے کا غم نہ رہا۔ بلکہ لڑکی ہونے کے کچھ فائدے نظر آنے لگے مثلاً ابا کا حکم تھا کہ لڑکیوں کی چوٹی نہ کھینچی جائے اور نہ ان کی بالیوں میں انگلی ڈال کر جھٹکے دیئے جائیں۔ لڑکیاں اگر ماریں تو سرکار سے شکایت کی جائے۔ مناسب سزا دی جائے گی۔ لڑکیاں کہاں بس خاکسار ہی ایک لڑکی تھی، جس کی شکایتیں ابا حضور کے دربار میں آئے دن پیش کی جاتیں مگر بھائی اتنے بدنام ہو چکے تھے کہ عموماً سزا انہیں ملتی، اٹلے ڈانٹ دیئے جاتے۔

علی گڑھ آکر عظیم بھائی کے وجود کا احساس دن بدن بڑھنے لگا۔ خدا جانے انہیں مجھ سے کیوں ایک دم دلچسپی پیدا ہو گئی مجھے تو بڑے بھائی نسیم ہمیشہ سے اچھے لگتے تھے، ان سے مار کھانے میں بھی مزا آتا تھا، کیونکہ وہ پیسے اور مٹھائیاں بھی تو دیتے تھے۔ عظیم بھائی نہ پیسے دیتے نہ چپٹیں مارتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بات کرتے۔

اور پھر انہوں نے مجھے تاریخ اور انگریزی پڑھانا شروع کی۔ یہ یاد نہیں رہا کہ ابتدا کیسے ہوئی۔ مگر اتنا یاد ہے کہ شام کو جب وہ کام سے ٹھکے ہارے آتے تھے تو اپنے برآمدے میں پلنگ پر لیٹ جاتے تھے اور مجھ سے کہتے زور زور سے پڑھو۔ پھر ترجمہ درست کرنے املا لکھواتے اس کے بعد باتیں کیا کرتے۔ یاد نہیں کیا باتیں تھیں جن سے ابتدا ہوئی۔ بعد میں تو حدیث و قرآن کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ان کا پڑھانے کا طریقہ عجیب تھا۔ کوئی ناول دیتے کہ اس کا ترجمہ کر ڈالو انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں۔ دس دس صفحے ترجمہ کروا ڈالتے۔ ناولوں کو ترجمہ کرنے میں کئی فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ پوری ناول کا ترجمہ کرنے سے پہلے ناول ختم کرنا پڑتی تھی اور اسی زمانہ سے مجھے شدت سے ناولیں پڑھنے کا چکر پڑ گیا۔ ساری ساری رات ناولیں پڑھیں، خاک پلے نہیں پڑا۔ لہذا پھر پڑھنا پڑیں۔ ہارڈی وہ پہلا ناول تھا جسے میں نے بقول عظیم بھائی گھول کر پی لیا تھا۔

اس زمانہ میں عظیم بھائی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں ہانگل ان کی آواز بازگشت بن گئی۔

”منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔“ جب میں بولتی تو سب چراتے کہ یہ میں نہیں عظیم بھائی بول رہے ہیں، اور عظیم بھائی نے میری ناسمجھی سے فائدہ اٹھایا وہ بات جو وہ خود نہ کہہ پاتے۔ بڑی ہشیاری سے میرے کان میں ڈال دیتے اور میں نہیٹ سے کہہ دیتی۔ اس دور میں بقول خاندان والوں کے انہوں نے مجھے خوب بھڑکایا۔ میری طبیعت جو پہلے ہی خود سر اور ضدی تھی ان کی شہ پاکر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔

وہ ان دنوں قانون پڑھ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک کارخانہ میں نوکری بھی کرتے تھے۔ مضمون بھی لکھا کرتے تھے۔ اس قدر محنت کرنے کے بعد وہ رات کو مجھے کئی گھنٹے پڑھایا کرتے۔ کبھی انہیں حرارت ہو جاتی، کبھی سینے میں درد ہوتا۔ ہاتھ پیراٹھتے، ان کی بیوی بیٹی ان کی چھاتی سینکا کرتیں۔ اور وہ مجھے پڑھایا کرتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے سر یا پیر دبانے کو نہیں کہا۔ اور میں نے بھی کبھی ان کا کوئی کام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بڑے بھائی جو تھے۔ اس لیے مجھے پڑھانا تو ان کا فرض تھا۔ ایک دفعہ ان کو بڑی شدت کا کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ دو گھنٹے

گئے اور چند صفحوں کا ترجمہ ختم نہ ہو پایا۔ مجھے جھلاہٹ آنے لگی۔

’ہم نہیں پڑھتے آپ سے، آپ تو اتنا کھانتے ہیں۔‘ میں نے جل کر کہا۔

’بیوقوف کہیں کی، کیا ہم جان بوجھ کر کھائیں رہے ہیں۔‘ انہوں نے ہنس کر کہا اور وعدہ کیا کہ اب نہیں کھائیں گے۔

پتہ نہیں انہیں میرے مستقبل سے کیوں دل چسپی ہو گئی تھی۔ میٹرک کرنے پر تو اس قدر خوش ہوئے کہ اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، چھٹیوں میں انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا لیا۔ چونکہ اب وہ جودھ پور میں وکالت کرنے لگے تھے۔ ان دنوں انہوں نے مجھے قرآن کا ترجمہ اور حدیث پڑھنے میں مدد دی۔

اور شاید کیا بلکہ قطعی میں نے ان کے افسانے پڑھ کر خود بھی چھپا کر لکھنا شروع کر دیا۔ حجاب اسماعیل، مجنوں گورکھ پوری اور نیاز فتح پوری کے افسانے پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا گویا یہ سچے میرے ہی اوپر بیت رہی ہے اور پھر میں نے خود کو افسانہ کی ہیروئین تصور کر کے نہایت چٹ پٹے قسم کے واقعات لکھنا شروع کیے۔

مثلاً میں بہت خوبصورت ہوں، بالکل حجاب اسماعیل کی ہیروئن کی طرح سنہری بال نیلی آنکھیں..... قرمزی رنگ کا لبادہ اوڑھے نیم دراز ہوں، ہیرو آتا ہے..... میرا پہلا ہیرو ہمیشہ ڈاکٹر ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ اس زمانہ میں ڈاکٹر ہی ایسا غیر مرد ہوتا تھا جو گھر میں آکر نبض ٹٹول سکتا تھا۔ یہ ڈاکٹر لازمی طور پر بہت حسین ہوتا تھا۔ رات بھر میرے سر ہانے بیٹھا رہتا۔ میری حالت خراب ہونے پر زار و قطار روتا، بے تابانہ مجھے چومتا اور میری حسین موت پر ڈارھیں مار کر روتا اور عموماً خودکشی کر لیتا۔ کیا مزے دار ہوا کرتی تھیں یہ کہانیاں۔ انہیں لکھنے میں اتنا ہی لطف آتا تھا جیسا چٹ پٹی کہانیاں پڑھنے میں آتا ہے۔ عموماً ایسی کہانیاں لکھ کر میں فوراً پھاڑ ڈالا کرتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا وہ گندی ہیں اور اگر کسی نے پڑھ لیں تو وہ جوتہ کاری ہوگی کہ بس۔

مگر نہ جانے کیوں پھر لکھ کر دوبارہ تبارہ پڑھنے میں لطف آتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے میں نے نہیں کسی اور نے لکھی ہے۔ اور واقعی وہ میری تصنیف نہ تھی اور نہ میرا روزنامہ تھی بلکہ وہ ان کہانیوں کا نچوڑ تھیں، جو مجھے بھاپکی تھیں۔ ایسی کہانیوں کا میرے سر ہانے انبار جمع ہو گیا اور وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔

ایک دن شیم جو عمر میں مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے ہیں، میرے پلنگ پر لیٹ گئے۔ سر ہانے کاغذ سرسرائے تو نکال کر پڑھنے لگے آہا..... بھٹنی نے کیا گندی گندی باتیں لکھی ہیں، توبہ توبہ!

شیم نے زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔

میں پاس ہی غسل خانے میں نہا رہی تھی، سر میں تیس ڈال چکی تھی انوہ بیان نہیں کر سکتی کہ کیا حالت ہوئی۔
یا خدا اگر ایک سطر اور آگے پڑھ لی تو پھر ڈوب مرنے کے سوا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔

بہت زدہ ہو کر میں نے غسل خانہ سے وہ زور زور کی چیخیں ماریں کہ سارا گھر ہل گیا۔ لوگ سمجھے شاید موری سے سانپ نکل آیا اور مجھے ڈس لیا۔ شیم بیچارہ کا غد پھینک پھاٹک میری جان کی خیر منانے لگا۔ میں نے اٹنے سیدھے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر شیم کا منہ نوح ڈالا۔ وہ بے چارہ ہونق منہ پھاڑ کر رہ گیا۔ آگے اسے پڑھنے کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ خود میری زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، میں نے اسی وقت سارا پلندہ ہلا کر خاک کر دیا۔ شیم نے بہت کہنے کی کوشش کی کہ میں نے نہایت گندی کہانیاں لکھی تھیں مگر میں نے جھٹلادیا کہ ٹرانسلیشن تھا۔ وہ بیچارہ پرلے درجہ کا جھوٹا مشہور تھا۔ اس لیے کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔

اب اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ اگر بجائے شیم کے کوئی دوسرا بھائی پڑھ لیتا تو واقعی قیامت آ جاتی بس اس دن سے میں نے تو بہ کی کہ اول تو ایسی بیہودہ کہانیاں لکھوں گی ہی نہیں اور اگر لکھوں بھی تو فوراً پھاڑ ڈالوں گی۔ حالانکہ اب اگر غور کرتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ ان کہانیوں میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

پھر کئی سال کچھ نہیں لکھا۔ بی اے کے بعد دنیا ہی بدل جاتی ہے۔ چار سال میں انسان کتنا بڑا ہو جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد چار سال میں نے کورس کی کتابیں مجبوراً پڑھیں۔ یونانی ڈرامہ ڈھن پلے اور ٹیکسٹر سے لے کر ایسین اور برنارڈ شاٹک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔ برنارڈ شانے میرا دل مٹھی میں لے لیا۔ میں نے اپنا پہلا مضمون یا ڈرامہ 'فسادی برنارڈ شا سے حد درجہ متاثر ہو کر لکھا۔ مواد میں نے اپنے ارد گرد سے لیا۔ اور اینٹ گارا برنارڈ شا سے سیکھا۔ پی ٹی کلاس میں میری ہم جماعت عذرا حیدر مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی۔ اس لیے میں نے فوراً برنارڈ شا کے ٹکڑے سے نکل کر کہانیاں لکھنا شروع کیں۔

اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا۔ جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر بھنا نہ جائے۔

پہلی دفعہ میں نے انہیں نہ جانے کون سے جلسے میں دیکھا تھا۔ بیگم بھوپال صدارت کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کڑکڑاتے جاڑے میں بیویاں موٹے موٹے دو شالے اور کوٹ ڈالے پنڈال کے اندر سوسوں کر رہی تھیں اور

رشیدہ آپا بغیر آستین کا بلاؤز پہنے دھواں دھار کچھ کہہ رہی تھیں۔ ان کے سیاہ بھونرا اور گھٹکھریا لے ہال ہوا میں اڑ رہے تھے کیونکہ تقریر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے سامنے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ بیویاں بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کے کئے ہوئے بالوں پر بغیر آستین کے بلاؤز پر اور کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی ہوئی بریلی ہوا پر۔ مگر ان کی تقریر بھی شاید کچھ کم خارا دار نہیں تھی۔ کیونکہ تقریر کے بعد انہیں بیگم بھوپال نے خوب ڈانٹا۔ اس دن ان کی بے حیائی اور بیباکی کا تہلکہ مچ گیا تھا اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر بہن لیا تھا۔ ۳۸ء میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔ اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔

اور پھر وہ میرا حسین ڈاکٹر ہیرو، شمع اگلیاں، نارنگی کے ٹگو نے اور قمر مزی لہادے چھو ہو گئے۔ مٹی سے بنی ہوئی رشیدہ آپا نے سنگ مرمر کے سارے بت منہدم کر دیئے۔

زندگی تنگی چم سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان سے گھنٹوں باتیں کر کے بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ انہیں کھا جاؤں، کیا کروں جو رشیدہ آپا سے مل چکے ہیں۔ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں، اگر وہ میری کہانیوں کی ہیروئن سے ملیں تو دونوں جڑواں بہنیں نظر آئیں۔ کیونکہ انجانے طور پر میں نے رشیدہ آپا کو اٹھا کر افسانوں کے طاقچے میں بٹھا دیا کہ میرے تصور کی دنیا کی ہیروئن صرف وہی ہو سکتی تھیں مگر جب غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا۔ ان کی بھرپور سیاسی شخصیت میرے قابو میں نہ آئی۔ مجھے روتی، ہورتی حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی۔ خواہ خواہ کی وفا اور وہ جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں۔ جذباتیت سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ عشق قلعی وہ آگ نہیں جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے۔ عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا میرے مذہب میں جائز نہیں۔ عشق مقوی دل و دماغ ہے نہ کہ جی کا روگ۔

یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رشیدہ آپا جیسی لڑکی سولہ کیوں پر بھاری پڑ سکتی ہے۔ ملک کی تقسیم کے بعد سوائے فسادات کے اور کچھ ذہن میں باقی نہ رہا۔ ملک بکھرا، دنیا بکھری اور اس کے ساتھ کتنی ہی حسین و نازک قدریں چور چور ہو گئیں۔ مقصدی ادب کے نعرے نے اور زیادہ گڑبڑا دیا۔ کیوں لکھیں اور کیا لکھیں؟ کے خمسہ میں پڑ کر اور بھی راستہ گم ہو گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بہت کچھ دیا اور بہت کچھ مٹا دیا۔ کتنے نئے ساتھی ملے اور پرانے چھڑ گئے اور پھر۔

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

انجن کے پر نچے اڑ گئے۔ بمبئی گروپ جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھا کرتی تھیں، فلموں میں غرق ہو گیا۔ ظاہر ہے صرف رسالوں کے لیے لکھ کر روزی نہیں کمائی جاسکتی۔ نہ ناولیں اور افسانوں کے مجموعوں سے بمبئی کا خرچہ چل سکتا ہے۔ فلم ہی ایک ایسی لائن ہے جہاں اگر ہاتھ لگ جائے تو قلم چلا کر روٹی کا سہارا ہو سکتا ہے۔ فلموں کے لیے لکھتے وقت معلوم ہوا کہ یہاں نہ بیباکی کی دھونس چلتی ہے نہ صاف گوئی کام آتی ہے۔ یہاں تو وہ چیز چاہئے جو چھپر بھاڑ کر دولت لائے۔ یہاں ایک خاص بندھی ہوئی لکیر کے مطابق چلنا ہوگا۔ لہذا چلنے والے چلے اور ناک کے بل چلے۔

فسادات کے بارے میں تجربہ سنی سنائی سے آگے نہ بڑھ پایا۔ دھانی بانگیں اور جڑیں سے زیادہ نہ محسوس کر پائی اور نہ لکھ پائی مگر ان دو مضامین کو لکھتے وقت میرے دل نے بڑے زور سے قلابازی لگائی۔ اس وقت تک میں نے جتنی کہانیاں لکھی تھیں۔ ان میں ماں باپ یا تو تھے ہی نہیں اگر تھے تو نہایت فضول سی شے۔ انہیں نظر انداز کر کے ہی میری دانست میں ان پر فتح پائی جاسکتی ہے۔ والدین سڑک کا روڑا ہی تو ہیں جو اولاد کے راستہ میں رکاوٹوں کے سوا کچھ نہیں پیدا کرتے۔ 'یہ نہ کرو، وہ نہ کرو' اب تک میرے دماغ میں بسا ہوا تھا لیکن یہ دو مضمون لکھتے وقت میں نے اپنی ماں کو دیکھا۔

سب انہیں اکیلا چھوڑ کر پاکستان جا چکے تھے۔ میں ان سے ملنے جو دھ پور گئی۔ اماں ہمارے ذاتی مکان کے سامنے ایک مختصر سے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اپنا وسیع مکان ریونیویوں کے قبضہ میں تھا۔ میں بچہ تو ڈھنڈا ہارا جڑے ہوئے کمرے میں اماں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اماں کو ہم لوگوں کو چومنے چاٹنے کی کبھی فرصت نہ ملی۔ مجھے نہیں یاد اس سے پہلے کبھی انہوں نے محبت کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس وقت مجھے دیکھ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اپنے قیام کے زمانے میں بار بار میں نے دیکھا وہ خاموش کھڑکی سے اپنے گھر کو تک رہی ہیں۔ جہاں بھرے پرے خاندان کے ساتھ ہم سب ہنسی خوشی رہتے تھے۔ بچے قلائیں بھرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں، ملاپ ہوتے تھے۔

میں نے ان کی عمر کی طرف دیکھا، اس اکیلے پن کو دیکھا۔ موٹے موٹے دس بچے پیدا کر کے بھی وہ اکیلی تھیں۔

میرے دل میں پیار کا طوفان ابل آیا۔ مامتا جاگ اٹھی۔ میں نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی بچی کی طرف دیکھا اور ان دو ہستیوں کے بیچ میں خود کو جکڑا ہوا پایا۔ اپنی ماں کو دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ ساری دنیا کی بڑھیوں پر پیار آنے لگا جو دنیا کو ہساتی ہیں۔ مرمز کر جنم دیتی ہیں، انہیں پالتی پوتی ہیں، جو سب کچھ ان پر نچھاور کرتی ہیں نہ ان سے اسٹامپ لکھاتی ہیں نہ پکے کاغذ پر رسید۔ اب اگر اولاد ان کے بڑھاپے کا خیال کر لے تو فرماں بردار ہے جو اپنے بال بچوں کے خرچہ سے کچھ نہ بچے تو مجبور ہے۔ پرانے زمانے میں بڑے بوڑھوں کو لوگ بیکار جنس سمجھ کر زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ یہ سنسان بڑھاپا کس قدر مہیب شے ہے۔

اور یہ بھی اتفاق ہی تھا جو میری اپنی اماں سے ملاقات ہو گئی اور کچھ سوئے ہوئے تار جاگ اٹھے۔ ابھی کتنے تار ہیں جو مردہ خاموش سوئے پڑے ہیں۔ کون جانے کون سے مضرب اور پیدا ہوں گے جن کی چوٹ سے بہت سی نیندیں ٹوٹیں گی۔ ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی جم جاتی ہے، ایک ننھا سا کنکر سطح پر گرتا ہے..... کائی چھٹ جاتی ہے..... جگمگاتی دنیا کا عکس پانی کی سطح پر لوہے لگتا ہے۔ انسان ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔

لفظ و معنی

جم غفیر	-	بہت بڑی بھیڑ
پایادہ	-	پیدل
مدقوق	-	دق زدہ، ٹی بی کا مریض
محکوم	-	مجبور، جس پر حکم چلایا جاتا ہے
خود سر	-	اپنی راے پر چلنے والا، گھمنڈی
شہ پاکر	-	اشارہ پاکر
ہیت زدہ	-	خوفناک، گھبرایا ہوا
خاردار	-	کانٹوں سے بھرا ہوا
واویلا	-	ہنگامہ، شور
سیما بی شخصیت	-	بے چین، بے قرار شخصیت
تحسد	-	الچس

پرچے - کلوے

مضراب - ستار پر ضرب لگانے کا کلا، تاروں کو چھیڑ کر آواز پیدا کرنے والا لکڑی کا کلا

آپ نے پڑھا

□ عصمت چغتائی نے اپنی آپ بیتی میں اس ماحول کی خاص طور پر عکاسی کی ہے جس میں انہیں ایک منفرد فن کار کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع ملا، والدین اور بھائی بہنوں کا خصوصی ذکر ہے۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے زمانے میں سب سے زیادہ اثرات رشید جہاں سے حاصل کیے ہیں۔ رشید جہاں کے خیالات اور ان کی شخصیت عصمت چغتائی کے ذہن میں ہمیشہ ایک مثال بنی رہی۔ ان کے علاوہ وہ اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے بھی خاصی متاثر رہی ہیں۔

□ عصمت چغتائی نے اپنی مختصر آپ بیتی میں اپنے خاندانی حالات بھی پیش کر دیے ہیں۔ اپنے عہد کی ادبی سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے، اپنی تعلیم و تربیت، معاصرین سے تاثرات، اپنی پسند و ناپسند، اپنے زمانے کے سیاسی و سماجی حالات۔ غرض ان تمام باتوں کا ذکر کر دیا ہے جو خود ان کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

آپ بتائیے

1. عصمت چغتائی کی والدہ کا نام کیا تھا؟ انہیں لوگ پیار سے کس نام سے پکارتے تھے؟
2. 'انگارے' کی مولف و مرتب کون تھیں؟
3. عظیم بیگ چغتائی سے عصمت چغتائی کا کیا تعلق تھا؟
4. مندرجہ ذیل محاورات و اشارات کے معنی بتائیے۔
تلا نہیں بھرنا، گز بھری زبان، گھول کر پی لینا، شہ پانا، ہاتھ دھو بیٹھنا، ناک کے بل چلنا
5. 'منصور' کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ یہ بات عصمت چغتائی نے کس کے ذکر میں کہی ہے۔

مختصر گفتگو

1. رشید جہاں سے عصمت چغتائی کی پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟
2. رشید جہاں نے ترقی پسند ادب کے ترجمان کے طور پر جو کتاب مرتب کی تھی اس کا نام کیا ہے؟
3. عصمت چغتائی آخری بار اپنی والدہ سے کہاں ملی تھیں؟

4. عصمت چغتائی کے والد پٹن لے کر کہاں رہنے لگے تھے؟

تذکرہ نخلو

1. عصمت چغتائی رشید جہاں کی شخصیت سے کیوں متاثر تھیں؟

2. عصمت چغتائی کی شخصیت کے چند اہم پہلوؤں کی وضاحت کیجیے۔

آپ نے، کچھ کریں

1. عصمت چغتائی کے بارے میں مزید کچھ باتیں جاننے کی کوشش کریں۔

2. عصمت چغتائی کے مشہور افسانوں کے بارے میں اپنے اساتذہ سے دریافت کیجیے۔

خاکا

خاکا انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے۔ شخصی خاکے کے لیے انگریزی میں Personal sketch کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں خاکے کے لیے جو اصطلاحیں رائج ہیں وہ 'مرقع' اور 'قلمی' تصویر ہیں۔ یہ آج تک خاکا میں رائج ہے۔ خاکا ایسی نثری تحریر کو کہتے ہیں جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ متذکرہ شخصیت کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں متذکرہ شخصیت کے خیالات، تصورات اور افکار و نظریات، پلاٹ، کردار، عادات و اطوار سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ خاکے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ شخصیت کی ظاہری و باطنی خصوصیات کے نمایاں اوصاف کو بیان کیا جائے جو اس کی انفرادیت اور شناخت کا ذریعہ ہیں۔

خاکا نگار کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ اس لیے خاکا نگار کا فرض اولیں ہوتا ہے کہ وہ کسی شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں یعنی دونوں پہلوؤں کو بیان کرتا ہے۔ ورنہ شخصیت کی مکمل تصویر سامنے نہ آ سکے گی جو خاکا نگاری کا اصل مقصد ہے۔

اردو میں خاکا نگاروں کی تعداد کافی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، محمد طفیل، شاہد احمد دہلوی، رشید احمد صدیقی، صوجی، محمد حسن اور احمد یوسف وغیرہ قابل ذکر خاکا نگار ہیں۔

مولانا ولایت علیؒ

دہلی تحریک کی تاریخ کم سے کم 1831ء سے 1858ء تک بہت حد تک خاندان صادق پور، پٹنہ سیٹی کے ولایت علی و عنایت علی کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس مشن کی ترقی و سر بلندی کے لیے ان کے بے نقصانہ جوش اور تحریک کی خدمت میں ان کی طرح طرح کی قربانیوں کی سرولیم ہنر نے بھی کھلے دل سے تعریف کی ہے۔

یہ دونوں صادق پور پٹنہ سیٹی کے فتح علی کے فرزند تھے۔ بڑے بیٹے ولایت علی 1205ھ 1790-91ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا قد اوسط، رنگ سانولا اور تن و توش بھاری تھا۔ داڑھی رکھتے تھے۔ بھنویں جڑی ہوئی تھیں۔

تحصیل علم: چار برس کی عمر میں مکتب میں بٹھائے گئے۔ ذہانت و ذکاوت وافر سے سات برس کی عمر میں آپ کی استعداد اس حد تک پہنچی کہ مقررہ معلم سے آپ کی تشفی نہ ہونے لگی اور آخرش آپ کے والد بزرگوار مولوی فتح علی صاحب نے آپ کا سبق اپنے ذمہ لیا۔ پھر وہ لکھنؤ بھیج دیے گئے۔ جہاں فرنگی محل کے عالم اشرف علی سے تعلیم حاصل کی۔ یہیں وہ سید احمدؒ سے ملے اور بیعت کی۔

شباب: اوائل عمری میں آپ بڑے بانکے تھے۔ آپ کا لباس و پوشاک لکھنؤ کے بانکوں سا تھا۔ اونچی چولی کا انگرکھا اور چوڑی دار چاغجائے زری کے کام کا ٹخنے ڈھکے ہوئے پہنا کرتے اور صاحب زادوں کی طرح سونے کی انگوٹھیاں اور چھلے انگلیوں میں ڈالے رکھتے اور خوشبو اور عطریات سے بے رہتے۔ آپ کے نانا مولوی رفیع الدین حسین صوبہ بہار کے آخری ناظم تھے اور جناب ولایت علی اپنے نانا کے بڑے لاڈ لے تھے۔

ولایت علی کی پہلی شادی پندرہ سال کی عمر میں بی بی امیرن دختر مقصود علی ساکن قصبہ لہنا پکھولی، ضلع آره سے ہوئی۔ وہ لاؤلد و فوات پاگئیں۔ ولایت علی نے دوسری شادی اپنے دکن کے قیام میں ایک مقامی امیر مرزا وحید بیگ کی بیٹی سے کی۔ اس شادی سے ان کی کئی اولادیں ہوئیں۔ پھر نکاح بیوگان کی سنت کو جاری کرنے کے لیے انھوں نے الھی بخش کی بیوہ دختر سے بھی شادی کی۔ یہ مقامی مسلمانوں کے اعلیٰ خاندانوں میں نکاح بیوگان کی پہلی مثال تھی۔

1826ء کا سنہ آیا تو سید احمد صاحب نے آزاد قبائل کی طرف روانہ ہونے کا منصوبہ بنایا اور جب عازم ہجرت ہوئے تو مولانا ولایت علی بھی دوسرے ہمراہیوں کے ساتھ ہم رکاب ہو گئے۔ سید صاحب نے راجستھان کے راستے سے جانے کا پروگرام بنایا کہ پنجاب سے ہو کر جانا آسان نہ تھا۔ اس موقع پر مولانا ولایت علی کو کابل کا سفیر بنا کر بھیجا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہاں سے بلا کر حیدر آباد میں تحریک کی تبلیغ و تنظیم کا کام سپرد کر کے متعین فرمادیا۔ چنانچہ ولایت علی بحسن و خوبی ان کاموں کو انجام دے رہے تھے کہ بمبئی میں بالاکوٹ کے دروانگیر ساتھ شہادت کی خبر ملی۔ ان خبروں نے ولایت علی کو مجبور کر دیا کہ وہ پٹنہ آ کر جماعت کی مزید تشکیل و ترتیب میں اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ پٹنہ پہنچ کر ولایت علی نے تحریک کی تنظیم نو اپنے ہاتھ میں لی۔ بہت سے لوگوں نے ولایت علی کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ انھوں نے مقامی مسجد نمو ہیاں کو جو پٹنہ میں وہابیوں کا ایک اہم مرکز تھی، محمد حسین کے ذمہ کیا اور اضلاع مظفر پور، دربھنگہ اور چمپہرہ میں بھی تحریک کی ذمہ داری انھیں کو سونپی اور شہر کی ایک اور مسجد فخر الدولہ میں نماز جمعہ دوبارہ جاری کی۔

مولانا ولایت علی نہایت ہی سرگرمی کے ساتھ مرکز کے کاموں میں منہمک تھے کہ 1844ء کا سنہ آ گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سکھ حکومت کے خلاف انگریزوں کی سازشیں کامیاب ہو رہی تھیں اور گلاب سنگھ ڈوگر والی جوں کی انگریز پرستی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ کچھ عجب طرح کی بے بسی اور افراتفری کا عالم تھا کہ سید ضامن شاہ رئیس بالاکوٹ نے جب اپنے علاقہ کے استحفاظ کی خاطر مدافعتیہ کارروائیاں شروع کیں تو گلاب سنگھ ڈوگر اسے ٹکر ہو گئی۔ اس ٹکر میں جب ضامن شاہ نے اپنی پسائی کا احساس کیا تو مولانا ولایت علی سے امداد کا طالب ہوا۔ مولانا نے پانچ سو مجاہدوں کا ایک جھڑمہ مرتب کر کے اپنے بھائی مولانا عنایت علی کی قیادت میں بالاکوٹ روانہ کیا۔ مگر مولانا ولایت علی کو کچھ ایسی خبریں ملیں کہ دلی سکون نہ ہوا اور صادق پور مرکز کی ساری ذمہ داری اپنے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین کے سپرد کر کے خود بالاکوٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا کی کمانداری میں جنگ کا یہ نقشہ ہوا کہ گلاب سنگ کی فوجوں کو شکست پر شکست ہونے لگی۔ یہ نقشہ دیکھ کر ضامن شاہ کے دل میں مجاہدوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کھلنے لگی اور اس نے غدرانہ روش اختیار کرنا شروع کر دی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ منصوبہ الحاق کے تحت انگریزی فوجیں پنجاب میں گھسنے لگی تھیں۔ بدلتے ہوئے حالات میں جس انگریزی سامراجی حکومت نے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور رانی چندرا کو برداشت نہیں کیا وہ مولانا ولایت علی کو کیوں کر برداشت کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے ضامن شاہ کی اقتدار

پرستانہ ذہنیت سے فائدہ اٹھا کر اس کو آلہ کار بنالیا اور پھر 1850 میں استھانہ کے لیے عازم ہجرت ہوئے اور دہلی پہنچے۔ یہاں انھوں نے جامع مسجد فتح پوری کے قریب ایک وسیع مکان میں قیام فرمایا۔ دوران قیام میں روزانہ وعظ کا سلسلہ قائم رہتا۔ اس مجلس وعظ میں بادشاہ بیگم زینت محل کے استاد مولانا امام علی اور دہلی کے مشہور اردو شاعر حکیم مومن خاں مومن بھی اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ مولانا کے وعظ و پند سے متاثر ہو کر یہ دونوں حضرات مولانا سے بیعت کے بعد حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ دہلی سے وہ اپنی منزل مقصود استھانہ پہنچ تو گئے مگر زیادہ دنوں تک زندگی نے وفا نہیں کی اور 5 نومبر 1852 میں عمر 64 برس رحلت فرما گئے۔ استھانہ میں ہی مدفون ہوئے۔

(تذکرہ صادقہ اور ہندوستان میں دہالی تحریک سے ماخوذ)

لفظ و معنی

لباس دہلیشاہ	-	لباس دہلیشاہ
صاحب زادہ	-	بیٹا
ترویج دین	-	دین کی اشاعت
بارِ عظیم	-	بڑا بوجھ
حلت	-	حلال ہونا
حرمت	-	حرام ہونا
شجاعت	-	بہادری
ذکاوت وافر	-	بے انتہا ذہانت
قائد	-	رہنما، قیادت کرنے والا
رنگ محل	-	لکھنؤ کی ایک قدیم درس گاہ کا نام
ہم رکاب	-	سفر میں ساتھ رہنے والا
استحفاظہ	-	تحفظ کی چاہت
والی جہوں	-	جہوں کا حاکم

آپ نے پڑھا

□ جنگ آزادی کے ایک مجاہد مولانا ولایت علی کا حال آپ نے گذشتہ صفحات میں مختصر طور سے پڑھا۔

□ آپ نے پڑھا کہ ان کا تعلق عارے صادق پور سے تھا۔ یہ ایسے علماء تھے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی میں کھل کر حصہ لیا۔

□ آپ نے کچھ ایسے ہندوستانی راجاؤں کا حال بھی پڑھا جنہوں نے اپنی سہولت اور ہوس کی خاطر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔

آپ بتائیے

1. مولانا ولایت علی صادق پوری کب پیدا ہوئے؟
2. مولانا ولایت علی صادق پوری کے والد کا نام کیا تھا؟
3. مولانا ولایت علی نے تحصیل علم کی شروعات کس عمر سے کی؟
4. مولانا ولایت علی صادق پوری کے نانا کا نام بتائیں۔
5. مولانا ولایت علی صادق پوری نے کتنی عمر پائی اور کہاں وفات پائی؟
6. مولانا ولایت علی صادق پوری کا ہم عصر والی جموں و کشمیر کون تھا؟
7. گلاب سنگھ کون تھا؟ اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
8. مولانا ولایت علی صادق پوری کے فن حرب سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
9. مولانا ولایت علی صادق پوری کے مکان پر کافی تعداد میں طلبا ہوتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کا نظم کہاں سے ہوتا تھا؟
10. مولانا ولایت علی صادق پوری اور گلاب سنگھ کی جنگ کہاں ہوئی تھی؟
11. انگریزوں نے مولانا ولایت علی صادق پوری کی جمعیت کو توڑنے کی کوشش کی۔ کیوں؟
12. حضرت مولانا اسماعیل شہید سے مولانا ولایت علی صادق پوری نے کس مضمون میں استفادہ کیا؟
13. مولانا ولایت علی صادق پوری نے کتنی شادیاں کیں اور پہلی شادی کے وقت آپ کی کیا عمر تھی؟
14. سید احمد نے مولانا ولایت علی صادق پوری کو ہندوستان کے کس علاقہ کی خلافت عطا کی تھی؟
15. ضامن شاہ نے خدارازہ روش کیوں اختیار کی؟

16. دہلی میں قیام کے دوران مولانا ولایت علی صادق پوریؒ کے وعظ کی مجلس میں شریک اور اہم شخصیتوں کے نام بتائیں؟

17. بالاکوٹ روانگی کے وقت مولانا ولایت علی صادق پوریؒ نے صادق پور مرکز کی ذمہ داری کس کے سپرد کی؟
تفصیلی گفتگو۔

1. مولانا ولایت علی کی ابتدائی زندگی کے احوال قلم بند کیجیے۔
2. مولانا ولایت علی صادق پوری کی غذا اور لباس کے بارے میں بتائیے۔
3. جنگ آزادی میں جن علماء نے حصہ لیا ان میں سے چند سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔
تفصیلی گفتگو۔

1. جنگ آزادی میں علمائے صادق پوری خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. مولانا ولایت علی نے جنگ آزادی کی لڑائی میں کس طرح حصہ لیا؟ سمجھا کر لکھیے۔
3. جنگ آزادی میں مولانا ولایت علی کی معاونت کن لوگوں نے کی؟ اور کن لوگوں نے ان کی مخالفت کی؟
آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد اور ساتھیوں کی مدد سے دہلی تحریک کے بارے میں مزید باتیں جاننے کی کوشش کیجیے۔
2. تحریک آزادی میں علمائے صادق پوری جو خدمات رہیں، ان کے بارے میں مزید کتابیں پڑھیے۔



خطبہ

خطبہ لفظ خطاب سے مشتق ہے۔ خطبہ کی جمع خطبات ہے۔ اس لفظ کے مفہوم کے لیے اردو میں لکچر اور اڈریس جیسی اصطلاحیں بھی رائج ہیں۔ ادائیگی کے لحاظ سے خطبہ تقریر کی طرح ہوتا ہے لیکن تقریر سے خطبہ اس معنی میں الگ بھی ہے کہ خطبہ دینے والے عموماً بڑے دانش ور ہوتے ہیں اور اکثر و بیشتر خطبات کے موضوع بھی متعین ہوتے ہیں۔ تمام خطبے کا ایک بنیادی مقصد ہوتا ہے کہ ان کو زیادہ لوگ سنیں اور ان سے استفادہ کریں۔ خطبے کو تخلیقی ادب میں شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مختلف عوام کی مذہبی تاریخ کے مطالعہ سے خطبات کی ادبی و علمی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔ مذاہب کے اندر پیغمبروں کی نصیحتیں، اولیائے کرام کے ملفوظات اور علمائے دین کے مواعظ خطبات کے زمرے میں آتے ہیں۔

ہندوستان میں جدید تعلیم کے فروغ کے دور میں خطبات کو باضابطہ ادبی شکل میں متعارف کرایا گیا۔ خصوصاً علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کے زمانے میں اس عہد کے دانش وروں نے پورے ملک میں جو عوامی خطبات کا سلسلہ قائم کیا انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ انگریز دانش وروں کے یہاں ایسے خطبات پہلے رواج پا چکے تھے اور انگریز دانش ور اپنے خطبات تحریری شکل میں بھی پیش کرنے لگے تھے۔

اسی زمانے میں سر سید احمد خان اور ان کے دیگر رفقاء نے کار اور سوامی دوپکانند کے تعلیمی خطبات اپنی افادیت ثابت کر چکے تھے۔ اردو میں پہلی بار سر سید کے علمی خطبات کو تحریری شکل دی گئی۔ سر سید کے رفقاء نے کار میں ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی کے علاوہ سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا علی میاں ندوی کے خطبات اردو نثر کے قیمتی ادبی سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خطبات کی علمی و ادبی اہمیت مسلم ہے۔ ان خطبات کے نتیجے میں ہی ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بے شمار اصلاحات پیش آئیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاندانی تعلق آفریدی پشطانوں کے ایک مذہبی گھرانے سے تھا۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں یہ خاندان اتر پردیش کے ایک قصبہ قائم گنج میں آباد ہو گیا۔ ذاکر صاحب کے والد نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور ہجرت کر کے حیدر آباد چلے گئے جہاں ان کی وکالت چل پڑی۔ حیدر آباد میں ہی 8 فروری 1897 کو وکیل صاحب کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ذاکر حسین رکھا گیا۔ بچپن میں ان کی تعلیم و تربیت اعلیٰ خاندان کے بچوں کی طرح انگریز ٹیوٹر کی سرپرستی میں ہوئی جب وہ نو سال کے ہوئے تو ان کے والد کا وصال ہو گیا۔ پھر ذاکر حسین اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنے آپا کی وطن قائم گنج واپس آ گئے اور ایفہ ضلع کے اسلامیہ



ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔

1911ء میں ان کے آپا کی ضلع فرخ آباد میں طاعون کی وبا پھیلی جس میں ذاکر حسین کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ذاکر صاحب نے ایم اے اور کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ کالج کے ماحول سے ذاکر حسین بہت متاثر ہوئے اور یہیں ان کی شخصیت میں انقلابی تبدیلی آئی۔ اسی زمانے میں اکتوبر 1920ء میں مہاتما گاندھی اپنی عدم تعاون تحریک کی حمایت حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ تشریف لائے اور ایک جذباتی تقریر کی جس سے متاثر ہو کر ذاکر حسین عدم تعاون تحریک میں شامل ہو گئے اور علی گڑھ کالج کو خیر باد کہہ دیا۔ اسی زمانے میں ذاکر حسین نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا جو بعد میں دہلی منتقل ہو کر یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر ذاکر صاحب جرمن تشریف لے گئے اور برلن یونیورسٹی سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ وطن واپسی پر ذاکر حسین ماہر تعلیم کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بنائے گئے۔ جہاں انھوں نے تعلیم کے میدان میں نئے نئے تجربات کیے۔

جب ملک آزاد ہوا تو مولانا ابوالکلام آزاد نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا۔ 1952ء میں انھیں راجہ سچا کا ممبر بنایا گیا اور 1957ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صوبہ بہار کے گورنر بنائے گئے۔ 1962ء میں وہ ملک کے نائب صدر جمہوریہ اور 1967ء میں صدر جمہوریہ ہند بنائے گئے۔ اسی عہدے پر فائز رہتے ہوئے 3 مئی 1969ء کو ان کا انتقال ہوا اور دہلی میں مدفون ہوئے۔

قومی تعلیم

تعلیم کے کام سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر ذہن کی تربیت تمدن کی ہر چیز سے نہیں ہوتی۔ جس طرح ہر جسم کو ایک غذا نہیں بھاتی، اس سے کہیں زیادہ ہر ذہن کو ہر ذہنی غذا بھی نہیں پہنچتی۔ بچہ جس سماج میں پیدا ہوتا ہے اس کے تمدن سے نسلی تعلق کی وجہ سے ہی اس کے ذہن میں کچھ مناسبتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس لیے خود اپنے سماج کے تمدن کی چیزوں سے اس کے ذہن کی بہتر تربیت ہو سکتی ہے۔ تربیت پا جانے، ترقی کر چکنے کے بعد ذہن سماج کی دوسری چیزوں کو بھی اپنا سکتا اور ان سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر شروع میں اپنی موروثی مناسبت کی وجہ سے ایک صورت میں بڑی آسانی اور دوسری میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں اس سے ہر وہ شخص جو تعلیم کے صحیح مقصد کو سمجھتا ہے اس بات پر مجبور ہے کہ بڑی حد تک ذہن کی تربیت کے لیے خود اس سماج کی تمدنی چیزوں سے کام لے جس سے طالب علم کا تعلق ہے، ورنہ اس کی کوشش کے اکارت جانے کا ڈر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود تعلیم کی ماہیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم قومی تعلیم کا نظام قائم کریں۔

قومی تعلیم کے تعلق سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ماہرین تعلیم کو ملک کی مختلف مذہبی اور جغرافیائی جماعتوں کے علیحدہ علیحدہ یا بالکل ایک سے نظام کے متعلق غور کرنا چاہیے۔ لیکن اگر ان کا فیصلہ یہی ہو جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے تو ایک اور مشکل سوال کا حل انھیں سوچنا پڑے گا یعنی اس طرح اجزا کو تمدنی آزادی دے کر وہ متحدہ قوم اور اس کی ریاست کو کمزور تو نہیں کر دیں گے۔ اس لیے کہ اگر اجزاء کی اس آزادی کے ساتھ ہی کل کے ساتھ محبت کا نہایت مضبوط رشتہ قائم نہ ہوا تو بے شک یہ آزادی کل قوم کے لیے کمزوری اور بعض حالات میں ہلاکت کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے ہمارے قومی نظام تعلیم کو اس مرکزی خیال کی ترویج کرنا ہوگی کہ جس طرح افراد کی ذہنی نشوونما اور شخصیت کی تکمیل کا یہی راستہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے سماج کے تمدن سے نشوونما دیں اور اس کی خدمت کو اپنی ترقی کا ذریعہ چاہیں اس طرح ہمارے بڑے ہندوستانی سماج میں جو جو جماعتیں اور چھوٹے چھوٹے سماج ہیں ان میں بھی یہ عقیدہ نہایت پختہ ہونا چاہیے کہ وہ بھی یہ حیثیت جماعت اس وقت پوری ترقی کر سکتی ہیں

جب کہ بڑے سماج کا اپنے کو خادم جائیں۔ اس کی بھلائی میں اپنی بھلائی اور اس کی برائی میں اپنی برائی دیکھیں۔ اس عقیدہ کا پیدا کرنا اگر سیاسی نظام کی خوبی پر منحصر ہے تو بہت حد تک نظام تعلیم پر بھی مبنی ہے۔

اور یہی کیا ایسے بے شمار سوال ہیں جن پر ہندوستان کے بہترین دماغوں کو غور کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مثلاً اگر ہمارا تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم ہو کر رہیں گے اور ان کا مقصد بھی تندرست اچھے بچے آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانہ پیدا کرنا ہوگا یا مختلف صلاحیت والوں کے لیے مختلف قسم کے مدرسے ہوں گے جس میں ابتدائی تعلیم کے بعد بچے کیجیجے پاسکیں گے اور اپنے خاص ذہنی رجحان کے مطابق تعلیم پائیں گے؟ کیا اس وقت بھی مدرسوں کو بس اس سے سروکار ہوگا کہ علم سکھا دیا لیکن علم کے برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی سامان نہ ہوگا؟ کیا اس وقت بھی ہمارا نصاب ایسا ہی چوں چوں کا مرتبہ ہوگا جیسا کہ اب ہے؟ کیا اس وقت بھی پیشہ اور عام تعلیم کو بالکل الگ الگ رکھا جائے گا، یا پیشہ کی تعلیم کا ایسا انتظام ہو سکے گا کہ وہی عام تعلیم کی منبوط بنیاد ثابت ہو؟ غرض یہ اور ان جیسے ان گنت مسائل ہیں جن کا ذکر کر کے میں آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا بھی صرف اس لیے ذکر کیا کہ یہاں ایک بڑے قوی و ذیادہ کے کارکن جمع ہیں، انھیں اس طرف توجہ دلانے سے شاید اس بات کا موقع مل سکے کہ ہمارے تعلیمی کام کرنے والے ان مسئلوں پر غور کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو قومی تعلیم کے کسی ادارے کی طرف سے شائع کر سکیں، تاکہ ہر جو ہوتے سب کے سوچ وچار سے قومی تعلیم کا ایک صحیح پروگرام تو تیار ہو جائے۔ اور اگر کل نظام کو ناموافق حالات کی وجہ سے رائج نہ کیا جاسکے تو کم سے کم ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو طے کرنے کے بعد نمونہ کے مدرسے قائم کیے جائیں اور کم سے کم تعلیم کی اس بنیادی منزل کو میوٹیل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں ہی کے ذریعہ درست کرنے کی تدبیر کی جائے۔

قومی تعلیم کے اسی سوچ نے ہماری قوم میں بڑی بیداری پیدا کی ہے اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں نے اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب اس بیداری کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس زمانہ میں قومی تعلیم گاہوں کا قیام ہماری قومی زندگی کے لیے شاید سب سے زیادہ اہم واقعہ تسلیم کیا جائے گا۔

لفظ و معنی

قومی بیداری - عقل و شعور کے لحاظ سے قوم کا جاگنا

تسلیم کرنا	-	مان لینا
تعلیم گاہ	-	تعلیمی ادارہ
خادم	-	خدمت کرنے والا
ضائع کرنا	-	برہادر کرنا
مختلف	-	الگ الگ
تدبیر	-	آپائے
راج کرنا	-	رداج دینا
ناموافق	-	موافق نہ ہونا، پریشان ہونا
کارکن	-	کام کرنے والے
پیشہ	-	کام کرنا
اثر انداز ہونا	-	اپنا اثر ڈالنا
سرکار	-	مقصد، تعلق
سوچ وچار	-	غور و فکر
عقیدہ	-	پختہ فکر و خیال
مبنی	-	بنیاد پر
مختصر کرنا	-	بھروسہ کرنا
مسائل	-	مسئلہ کی جمع، پریشانی
نتائج	-	نتیجہ کی جمع
نظام تعلیم	-	تعلیم دینے کا طریقہ
بے شمار	-	ان گنت

آپ نے پڑھا

□ ڈاکٹر ذاکر حسین نے قومی و دیہی پٹیہ کے جلسے میں جو خطبہ دیا وہ آپ نے گذشتہ صفحات میں پڑھا۔

□ ڈاکٹر ذاکر حسین نے قومی تعلیم کے سلسلے میں مختلف سطحوں پر غور و فکر کا مشورہ دیا ہے تاکہ ایک یکساں پروگرام تیار

ہو جائے۔ اس سلسلے میں ابتدائی تعلیم کے لیے مدرسوں کے قیام کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے۔

آپ بتائیے

1. ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعلق کس گھرانے سے تھا؟
2. ذاکر حسین کے والد کس پیشے سے تعلق رکھتے تھے؟
3. ڈاکٹر ذاکر حسین کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
4. ذاکر حسین کس صوبہ کے گورنر ہے؟
5. ڈاکٹر ذاکر حسین انتقال کے وقت کس عہدے پر فائز تھے؟
6. ذاکر حسین کا انتقال کب ہوا؟

مختصر گفتگو

1. ڈاکٹر ذاکر حسین کا مختصر خاندانی پس منظر بیان کیجیے۔
2. قومی تعلیم کے موضوع پر پانچ جملے لکھیے۔
3. ماہر تعلیم کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین کا تعارف پیش کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

1. قومی تعلیم کے موضوع پر ایک مضمون پر قلم کیجیے۔
2. ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی کارناموں کا جائزہ لیجیے۔
3. ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔

آئیے، کچھ کریں

1. اپنے استاد کی مدد سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے تعلیمی کارناموں کا ایک خاکہ تیار کیجیے۔
2. کلاس کے طلبہ کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت پر ایک مذاکرہ کیجیے۔

نظم

نظم کے لغوی معنی، انتظام و ترتیب یا آرائش، کے ہیں، عام مفہوم میں یہ لفظ نثر کے مد مقابل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے اس میں وہ تمام اصناف اور اسالیب شامل ہوتے ہیں جو ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں، اصطلاحی معنوں میں غزل کے علاوہ تمام شاعری کو نظم کہتے ہیں۔

عام طور پر نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ خیال کا تدریجی ارتقا بھی نظم کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ ارتقا طویل نظموں میں زیادہ واضح ہوتا ہے جب کہ مختصر نظموں میں ارتقا واضح نہیں ہوتا ہے اور اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔

نظم کے لیے نہ ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوعات کی۔ چنانچہ اردو میں غزل اور مثنوی کی ہیئت میں نظمیں اور آزاد و معر نظمیں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس طرح کوئی بھی موضوع نظم کا موضوع ہو سکتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے نظم کی چار قسمیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ پابند نظم: پابند نظم ہم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترکیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی جاتی ہے۔ نئے انداز کی ایسی نظمیں بھی، جن کے بندوں کی ساخت مروجہ میٹروں سے مختلف ہو یا جن کے مصرعوں میں قافیوں کی ترتیب مروجہ اصولوں کے مطابق نہ ہو، لیکن ان کے تمام مصرعے برابر کے ہوں اور ان میں قافیے کا کوئی نہ کوئی التزام پایا جائے، پابند نظم کہلاتی ہے۔

نظم معر: نظم معر ایسی نظم کو کہا جاتا ہے جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیے کی پابندی نہ ہو۔ نظم معر کو نظم عاری بھی کہا جاتا ہے۔

آزاد نظم: آزاد نظم ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں قافیے اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی اور اس کے ارکان بحر کم یا زیادہ ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔

نثری نظم: نثری نظم چھوٹی بڑی نثری سطروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں نہ تو ردیف اور قافیے کی پابندی ہوتی ہے اور نہ ہی بحر اور وزن کی۔

خواجہ الطاف حسین حالی

پورا نام خواجہ الطاف حسین تھا اور تخلص حالی کرتے تھے۔ ان کی پیدائش 1837ء میں ضلع کرنال کی مشہور جگہ پانی پت میں ہوئی۔ خواجہ ایزد بخش ان کے والد کا نام تھا۔ نو برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ ان کے بڑے بھائی خواجہ ابرار حسین نے ان کی پرورش کی۔ پانی پت کے مشہور حافظ ممتاز حسین کی نگرانی میں قرآن شریف حفظ کیا۔ حالی کی باضابطہ تعلیم نہیں ہوئی لیکن انھوں نے کچھ فارسی سید جعفر علی سے اور عربی صرف و نحو میں تعلیم حاجی ابراہیم حسین سے حاصل کی۔ ان کی شادی سترہ برس کی عمر (1854ء) میں اپنے ماموں میر باقر کی صاحبزادی اسلام الہاس سے ہوئی۔ حالی کے معاشی حالات خراب تھے۔ انھوں نے دہلی آکر بے سروسامانی کے عالم میں علم حاصل کرنا شروع کیا۔ یہاں ان کی ملاقات غالب سے ہوئی۔ انھوں نے اپنی کچھ غزلیں غالب کو دکھائیں۔ غالب نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت ان کا تخلص خشتہ تھا۔



حالی 1856ء میں معاش کی تلاش میں نکلے اور انھیں ہمار میں معمولی تنخواہ پر اپنی کمشنر کے دفتر میں جگہ ملی۔ کچھ دنوں کے بعد حالی پھر دلی آئے یہاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان سے متاثر ہو کر اپنے بچوں کی اتالیقی ان کے سپرد کی۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہوئے۔ حالی کی نظموں سے اردو میں نظم جدید کی راہ ہموار ہوئی۔ انھوں نے دلی کے اینگلو مرہٹہ اسکول میں تدریسی فرائض بھی انجام دیئے۔ حالی نے پانی پت میں ایک لائبریری بھی قائم کی۔

مولانا حالی اپنے دور کے ممتاز تنقید نگار اور شاعر کی حیثیت سے شہرت یافتہ ہیں۔ انھوں نے اردو میں تنقید نگاری کو باضابطہ ایک صنف ادب کی طرح متعارف کرایا۔ ان کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' اردو میں باقاعدہ تنقید نگاری کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ تصنیف دراصل وہ مقدمہ ہے جو انھوں نے اپنے اہم شعری کارنامے 'مسدس حالی' کے پیش لفظ کے طور پر لکھا تھا۔ مسدس حالی 'مد و جزا' اسلام کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ مسدس سرسید کی اصلاحی تحریک کے نتیجہ میں تخلیق کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود سرسید نے اس کی خوب تعریف کی ہے۔

حالی نے نثر و شاعری کے دوسرے شعبوں میں بھی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ غزل گوئی اور نظم نگاری کے ارتقاء میں بھی ان کی اہم خدمات رہی ہیں۔ انھوں نے سرسید کی سوانح بہ عنوان 'حیات جاوید' اور غالب کی سوانح بہ عنوان 'یادگار غالب' لکھ کر سوانح نگاری کی بھی ایک مضبوط روایت قائم کر دی ہے۔ 31 دسمبر 1914ء کو حالی کا انتقال ہوا اور پانی پت میں دفن ہوئے۔

سرس حالی

کسی قوم کا جب اٹلتا ہے دفتر تو ہوتے ہیں مسخ ان سے پہلے تو انگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر

نہ دنیا میں ذلت نہ عزت کی پروا

نہ عقبی میں دوزخ نہ جنت کی پروا

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا تعیش میں جینا نمائش پہ مرنا

سدا خواب غفلت میں بے ہوش رہنا

دم نزع تک خود فراموش رہنا

پریشان اگر قحط سے اک جہاں ہے تو بے فکر ہیں کیونکہ گھر میں سہاں ہے
اگر باغ امت میں فصل خزاں ہے تو خوش ہیں کہ اپنا چمن گلستاں ہے

بنی نوع انساں کا حق ان پہ کیا ہے

وہ اک نوع نوع بشر سے جدا ہے

کہاں بندگان ذلیل اور کہاں وہ بسر کرتے ہیں بے غم قوت ناں وہ
پہنتے نہیں جزمور و کتاں وہ مکاں رکھتے ہیں رشک خلد و جتاں وہ

نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر

نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدی کا کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا خلّاق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان
 کہ کام آئے دنیا میں انسان کے انسان
 عمل جن کا تھا اس کلام میں پر وہ سرسبز ہیں آج روئے زمیں پر
 تفوق ہے ان کو کہیں نہیں پر مدار آدمیت کا ہے اب انہیں پر
 شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے
 وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے
 عروج ان کا جو تم عیاں دیکھتے ہو جہاں میں انہیں کامراں دیکھتے ہو
 مطیع ان کا سارا جہاں دیکھتے ہو انہیں برتر از آسماں دیکھتے ہو
 یہ ثمرے ہیں ان کی جوانمردیوں کے
 نتیجے ہیں آپس کی ہمدردیوں کے

لفظ و معنی

مسخ	-	ہگڑنا، خراب ہونا
توکل	-	مالدار
ہادی	-	راستہ بتانے والا
عقبی	-	آخرت
مفلوک	-	پریشاں حال، غریب
قیح	-	عیش پسندی
نزع	-	موت کا وقت
بنی نوع انسان	-	انسانوں کی جماعت
سمور	-	لومڑی کی کھال کا لباس، قیمتی لباس
ہنساں	-	ایک قیمتی کپڑا
غلد	-	جنت

جنت	-	جناں
خلق کی جمع جملہ اوقات	-	خلائق
دوستی، محبت	-	ولا
طاقت و کلام (قرآن کریم)	-	کلام متین
برتری	-	تفوق
جمع ہے کہ وہ (کہتر و مہتر) بہ معنی چھوٹے بڑے لوگ	-	کھین و مہین
انحصار	-	مدار
گامیاب، فتح مند، فاتح	-	کامران
فرماں بردار	-	مطیع

آپ نے پڑھا

□ زیر نصاب نظم خواجہ الطاف حسین حالی کی مسدس حالی سے ماخوذ ہے۔

□ یہ الگ سے کوئی نظم نہیں ہے بلکہ نگری تسلسل کا لحاظ کرتے ہوئے مسدس حالی کے چند بندوں کو ترتیب دے کر نظم کی شکل دے دی گئی ہے۔

□ مسدس حالی مسلمانوں کے عروج و زوال کی منظوم داستان ہے جو سرسید کی فرمائش پر حالی نے تصنیف کی۔

□ زیر نصاب نظم کے اشعار میں شاعر نے ملت کے نوجوانوں کی غفلت اور بے حسی کا رونا روایا ہے۔ ساتھ ہی نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کا حل بھی نکالا ہے اور مسلم نوجوانوں کو مخاطب کر کے بہت ہی سبق آموز نصیحتیں کی ہیں۔ نظم میں شاعر کا واعظانہ پہلو نمایاں ہے۔

آپ بتائیے

1. سرسید کی فرمائش پر حالی نے کون سی کتاب لکھی؟
2. مسدس حالی کا دوسرا مشہور نام کیا ہے؟
3. مسدس حالی کس کی تجویز پر تخلیق کیا گیا؟
4. حالی کا پورا نام کیا ہے؟

5. حالی کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

مختصر گفتگو

1. حالی کی کون سی تصنیف لوگوں کو زبانی یاد تھی؟

2. حالی کی دو مشہور سوانحی کتابوں کا نام بتائیے۔

3. حالی نے لاہور کی کہاں قائم کی؟

تفصیلی گفتگو

1. حالی نے مسدس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ پیش کیا ہے۔ تفصیل سے اس پر روشنی ڈالے۔

2. حالی کی حیات و خدمات پر اپنے خیالات قلم بند کیجیے۔

آپنے، کچھ کریں

1. متذکرہ بالا بندوں میں سے پانچویں اور چھٹے بندوں کا مفہوم بیان کیجیے۔

